

امام خمینی کی سیاسی زندگی



ایران کے سیاسی حالات

(مشروطہ سے رضاخان کے مظالم تک)

گزشتہ سے پیوستہ

از: محمد حسن رحیمی

کے بجائے ذاتی مفاد و مصالح کی تکمیل میں گئے ہوئے ہیں اور اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں لہذا ایرانی عوام پارلیمنٹ اور اس کے اراکین سے پوری طرح ناامید اور بے تعلق ہو گئے۔ چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب شاہی فوج نے پارلیمنٹ پر حملہ کیا تو ایرانی عوام کی طرف سے کوئی رد عمل دکھائی نہ پڑا۔ یہ بات صرف تہران تک محدود نہ تھی بلکہ ایران کے دیگر شہروں میں بھی کسی نے کوئی احتجاج نہ کیا۔

شاہ شاہی دربار کے اعلیٰ حکام اور انقلاب مشروطیت کے مخالفین اس لڑائی میں ایک فاتح کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آ گئے اور ان لوگوں نے مشروطہ طلب افراد کے خلاف ظلم و ناانسانی کا بازار گرم کر دیا اور ایرانی عوام کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ ان نام نہاد فاتحین نے ایرانی عوام پر بڑے مظالم ڈھائے۔ جب لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ان کی عزت و آبرو اور ملکیت و زندگی ان مٹھی بھر لوگوں کے

وبرباد کر ڈالے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس بمباری کے دوران کچھ اراکین مارے گئے کچھ زخمی ہوئے اور کچھ گرفتار کر لئے گئے۔ دلچسپ اور غور طلب بات یہ ہے کہ دہشت گردانہ حرکتوں میں ملوث شدت پسند اراکین پارلیمنٹ جو دوسروں کو حکومت کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے اس بمباری کے دوران روپوش ہو گئے یا برطانوی سفارت خانہ کے اندر پناہ گزین ہو گئے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی اور پارلیمنٹ کی تشکیل کے کئی ماہ بعد بھی ایران کو امیدوں کے برعکس کوئی مفید عملی اقدام نظر نہ آیا بلکہ مسائل و مشکلات نے سرسامانی و مفلوک الحالی نیز بد امنی اور عدم سلامتی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کے عوام نے یہ بھی دیکھا کہ اراکین مجلس کے درمیان تفرقہ و اختلاف اور گروہ بندی کا بازار گرم ہے اور یہ لوگ عوامی فلاح و بہبود

اسی زمانہ میں برٹنی اسی طاقتور حکومت کی زیادتیوں سے خوف زدہ ہوئے اور ان کے درمیان ایک معاہدہ طے کیا۔ ان دونوں ممالک کے مسئلہ ایران کے ساتھ اپنے تمام باہمی اختلافات کو حل کرنا شروع کر دیا۔ اس معاہدے بعد برطانیہ نے جو اب تک تحریک مشروطیت کی حمایت کر رہا تھا، مشروطہ طلب جماعت کی طرف سے اپنی چھوڑ دی اور روس کو اس بات کی غلطی چھوٹ دے دی کہ وہ ایران کی نو تشکیل شدہ مشروطہ حکومت کا کام تمام کر دے کیونکہ نظام مشروطیت روس کے آزادی طلب اور انقلاب پسند عناصر کے لئے امید کی روشن کرن اور حکومت روس کے لئے ایک بڑا خطرہ تھا۔ ٹھیک اسی زمانہ میں ایرانی پارلیمنٹ کے بعض تندرو اراکین نے اپنی دہشت گردانہ حرکتوں کی وجہ سے محمد علی شاہ کو ایک مناسب بہانہ فراہم کر دیا کہ وہ ظالم قزاق فوجی افسروں کی مدد سے ایرانی پارلیمنٹ پر بمباری کے ذریعہ اسے تباہ

ہاتھ کا کھلونہ بن چکی ہے تو انہوں نے دفاعی کارروائی شروع کی۔ تہریز میں ستار خان اور باقر خان نے ظالم شاہی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے لوگوں سے یہ اپیل کی کہ وہ حکومت کی ظالمانہ راہِ دروش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ عوام نے ان کی اس احتجاجی اپیل کا پر جوش استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر احتجاجی جماعت کے ہاتھوں میں آ گیا۔ شاہ نے تہریزی عوام کی اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لئے ایک بڑا فوجی دستہ روانہ کیا کیونکہ اسے ڈر یہ تھا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کی یہ آگ ایران کے دوسرے شہروں میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ تہریز کے لوگوں نے اس ظالم شاہی فوجی دستہ کا بھرپور مقابلہ کیا جس کی وجہ سے حکومت اس احتجاجی تحریک پر غلبہ نہ حاصل کر سکی۔ دوسری طرف علمائے عراق (مثلاً آخوند خراسانی، مازندرانی اور تہرانی) اپنے جو شیخے بیانات اور انقلابی بیانات کے ذریعہ لوگوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ شاہی مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ان علماء نے تہریز میں ظالم شاہی حکومت کا مقابلہ کرنا ناممکن (ج) کے ہر لوہ دشمنان خدا کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ لہذا انہیں علماء کے ان بیانات اور مذہبی احکامات نے انقلابی عوام کے حوصلوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا چنانچہ وہ حکومت کے خلاف اپنی انقلابی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ جیسے جیسے ایران کے دوسرے شہروں میں انقلاب تہریز کی خبر پہنچی اور لوگوں کو علمائے عراق کے انقلابی بیانات کا علم ہوا وہ لوگ بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ حکومت کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔

برطانیہ اور روس کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتحال پر قابو پانا ایرانی حکومت کے

بس کی بات نہیں ہے لہذا ان دونوں ملکوں نے مختلف پہلوؤں سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے ایک طرف تو شاہ ایران کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کو تسلیم کر لے۔ دوسری طرف ایک دھمکی آمیز مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے مشروطیت طلب علماء سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی انقلابی سرگرمیوں سے باز آجائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ روسی فوج شہر تہریز کے اندر داخل ہو گئی اور شہر کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔

عوام نے ان کی اس احتجاجی
اپیل کا پر جوش استقبال کیا اور
دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر
احتجاجی جماعت کے ہاتھوں
میں آ گیا۔

لیکن علماء بالخصوص آخوند خراسانی نے ان دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ مجاہدین تہریز کی حمایت کرنے کے لئے ایک جماعت کے ساتھ تہریز پہنچ کر انقلابی عوام کی قیادت و رہنمائی کریں۔ چنانچہ یہ علماء و سیول ہزار مسلح اور غیر مسلح عراقی عوام بالخصوص اہل نجف کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہو گئے جیسے ہی برطانیہ اور روس کو علماء عراق کے اس شدید رد عمل کی خبر ملی تو ان لوگوں نے گیلان اور بختیاری کے دو نامور لوگوں کو جو درحقیقت ان بیرونی ممالک کے ایجنٹ تھے اس

بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کا پر تہم لئے ہوئے آگے قدم بڑھائیں اور ایرانی عوام کی اس انقلابی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور شمال و جنوب کے راستے سے تہران پر قبضہ کر لیں۔
ادھر عراقی علماء ہزاروں مسلح و غیر مسلح افراد کے ہمراہ نجف سے کربلا پہنچ چکے تھے جیسے ہی انہیں کربلا میں فتح تہران کی اطلاع حاصل ہوئی انہوں نے سفر تہران کا ارادہ ترک کر دیا اور سب لوگ نجف واپس چلے گئے اور فاتحین نے اقتدار کو آپس میں اس طرح تقسیم کر لیا کہ روسی اور برطانوی ایجنٹوں کے درمیان توازن برقرار رہے۔ ”مجاہد“ کے لقب سے مشہور ان حکمرانوں نے سب سے پہلے انقلاب مشروطیت کے مخالفین کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کیا جس میں شیخ فضل اللہ نوری بھی شامل تھے۔ شیخ فضل اللہ نوری کو ایک ایسے عالم فاضل کی عدالت میں پیش کیا گیا جو فری مین نامی برطانوی تنظیم سے وابستہ تھا۔ اس قاضی نے انہیں پچاسی کی سزا سنائی اور ۱۳ رجب ۱۳۲۷ھ یعنی یوم ولادت حضرت علی علیہ السلام کے موقع پر تہران میں واقع توپخانہ گراؤنڈ پر انہیں پچاسی دیدی گئی تاکہ ایرانی عوام آئندہ ان کی برسی کے سلسلے میں مجلس سوگ و عزاکا اہتمام نہ کر سکیں۔ دوسری طرف مظفر الدین شاہ کے ظالم صدر اعظم عین الدولہ کو جو انقلاب مشروطیت کا سخت مخالف اور اکثر مجاہدین انقلاب کا قاتل بھی تھا فاتح حکام اور افسروں کے سامنے پیش کیا گیا اور ان لوگوں نے نہ صرف معافی دیدی بلکہ اس کے ساتھ ایک یادگاری تصویر بھی کھینچوائی گئی!

حاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت سے ایرانی عوام بالخصوص علمائے دین بہت متاثر ہوئے اور

مجموعی طور پر ان اسباب و عوامل نے عراق میں ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ مشروطیت طلب علماء کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور نوبت یہ آئی کہ نجف اشرف میں بھی جو شیعہ علماء کی قدیم چھاؤنی اور مشروطہ طلب علماء کے اہم اور قسمت ساز فیصلوں کا مرکز تھا علماء دین کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ نہ تھی۔ طلباء اور عوام جو بالعموم مشروطیت کے مخالف تھے اور جن کو صحیح اطلاع بھی نہیں ہو کرتی تھی مشروطہ طلب علماء کے خلاف تہمت لگانے سے باز نہیں آتے تھے اور یہ لوگ آخوند خراسانی جیسے نامور عالم دین پر بھی الزام عائد کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب روس اور برطانیہ کی فوجوں نے شمال و جنوب سے ایران پر قبضہ کر لیا (۱۳۲۹ھ) شہر تبریز میں روسی افواج نے مشروطہ طلب عناصر کا قتل عام شروع کر دیا اور مقتولین میں شیعہ الاسلام تبریزی جیسے صاحب عظمت عالم دین بھی موجود تھے۔ عراق پر بیرونی افواج کے قبضہ کی خبر سے علمائے عراق کے درمیان ایک بار پھر ہچکچاہٹ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اپنی ناراضگی کے باوجود ان لوگوں نے تبران جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ ایرانی عوام کی مدد سے غاصب فوج کو ملک کے باہر نکال سکیں اور انقلاب مشروطیت کے سایہ میں جن لوگوں نے اقتدار کی ہانگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے ان پر بھی نگاہ رکھ سکیں۔ عراق کے ہزاروں مسلح اور غیر مسلح افراد اور قبائل نے علماء نجف و کربلا کی اطاعت میں ایران جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سید کاظم یزدی اگرچہ عراق سے باہر تو نہیں نکلے لیکن انہوں نے اپنے ایک بیان میں ایران پر روسی اور برطانوی فوجی حملے کی سخت مذمت

انہیں گوشہ نشین ہونا پڑا۔ دوسری طرف ایران سے حاصل شدہ اطلاعات سے یہ پتہ بھی چل رہا تھا کہ حقیقی مشروطہ طلب افراد کو طرح طرح سے پریشان کیا جا رہا ہے اور ان کی جان و عزت و آبرو خطرہ میں ہے۔

شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے سب سے پہلے علماء عراق کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا کیونکہ یہ شہادت درحقیقت علماء دین کی بے حرمتی کا پیغام تھی۔

حاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت کے تقریباً ایک سال بعد تبران کے دوسرے اہم مشروطیت طلب عالم دین سید عبد اللہ بیہبانی کو ایک قاتلانہ حملے کے دوران شہید کر دیا گیا اور یہ پتہ چلا کہ اس قتل میں ایرانی پارلیمنٹ کا ایک ایسا ممبر ملوث تھا جو انقلاب مشروطیت سے قبل اپنی دین مخالفت حرکتوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس خبر نے مشروطہ کے نئے ارباب اقتدار کے سلسلے میں علماء دین کی بدگمانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ ایران کے نائب السلطنت کے نام ایک ٹیلیگرام میں آخوند خراسانی اور عبد اللہ مازندرانی نے ”بڑے قومی لیڈران اور دین پرست مجاہدین“ کی جدوجہد کے سلسلے میں شکر یہ ادا کرتے ہوئے حکومت و پارلیمنٹ میں موجود مخرب و فاسد عناصر کی موجودگی ان کی مغرب پرستی اور اسلامی اصول و قوانین کے سلسلے میں ان لوگوں کی لاپرواہی پر اپنی ناراضگی و پریشانی کا اظہار بھی کیا۔

پورے ملک میں غم و فتنہ کی لہر دوڑ گئی۔ شیخ فضل اللہ نہ صرف یہ کہ تبران کے ایک نامور عالم دین تھے بلکہ شاہی حکومت کے خلاف تحریک تمباکو میں انہوں نے نمایاں خدمات بھی انجام دی تھیں۔ وہ تحریک مشروطیت کے آغاز سے پارلیمنٹ کی تشکیل تک اور اس کے بعد مجوزہ آئین کے سلسلے میں ہونے والے مباحث کے دوران دیگر علمائے دین کے ساتھ رہے اس کے علاوہ ایک نمایاں مجتہد کی حیثیت سے وہ اپنے حق و فریضہ سے بخوبی واقف تھے اور اپنی اجتہادی صلاحیت کی بنیاد پر ہی انہوں نے مجوزہ آئین کی غیر معمولی اسلامی دفعات کی مخالفت کی تھی اور اسے ”ہرمت“ کہا تھا۔

بہر حال شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے سب سے پہلے علماء عراق کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا کیونکہ یہ شہادت درحقیقت علماء دین کی بے حرمتی کا پیغام تھی۔ اس کے علاوہ نجف اشرف میں ایسے علمائے دین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو شیخ فضل اللہ کے ہم خیال تھے۔ ان لوگوں میں اس دور کے مراجع تقلید سید کاظم یزدی بھی شامل تھے جو بنیادی طور پر سیاست میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے اور ایران و عراق و روس میں ان کے مقلدین و معتقدین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

واضح رہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مشروطیت اور اس کے طرفداروں کے سلسلے میں علمائے عراق کے درمیان بڑی بدگمانیاں موجود تھیں چنانچہ شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے علمائے دین کی بدگمانی کو یقین میں تبدیل کر دیا اور لوگوں کو ایک عمدہ دلیل مل گئی۔ دوسری طرف عراق کے جن مشروطہ طلب علماء نے شیخ کی شہادت پر سکوت و شرمندگی کا رویہ اختیار کیا ان سے سوالات کی بھرمار ہو گئی اور بالآخر

نی۔ علمائے نجف کا یہ قافلہ ایران کی طرف رونے کے لئے پوری طرح آمادہ تھا لیکن جس روز اس قافلے کی روانگی تھی اسی دن صبح کے وقت مہلکوں کے حالات میں آخوند خراسانی کی موت واقع ہو گئی۔

اگرچہ خراسانی کی موت کی وجہ سے دیگر علماء کے فیصلے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا اور وہ لوگ کاظمین کی طرف روانہ ہو گئے لیکن آخوند جیسی نمایاں شخصیت کے فقدان نے ایرانی علماء اور حکمرانوں کی طرف سے نئے نئے مختلف اطلاعات کی وجہ سے وہ لوگ اپنے نئے ایران کو جاری نہ رکھ سکے اور اس طرح ایران کے سیاسی واقعات میں علماء کی نہ اور استعدالت اور مشروطیت کی صحیح قیادت کا دوسرا موقع بھی ہاتھ سے چلا گیا۔ ویسے تحریک مشروطیت میں اس دور کے مذہبی علماء سے اتنے عظیم کام کی امید بھی نہ کرتی جاپتے تھے کیونکہ ان لوگوں نے قدم نہ بھی ردیوت کے سایہ میں تعمیر حاصل کی تھی اور طلب علمی سے انہوں نے بھی ان کی مذہبی مصروفیات بائیں

روایتی انداز کی تھیں اور وہ اپنی روایتی مصروفیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو انجام دیا کرتے تھے لہذا یہ بات ان روایتی علماء کے لئے کسی حد تک دشوار معلوم ہوتی تھی کہ مغرب سے تعلقات کے نتیجے میں ایران میں جو مسائل پیدا ہو گئے تھے انہیں وہ لوگ بخوبی سمجھ سکیں۔

سیاسی میدان سے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی علیحدگی کی وجہ سے مغرب پرست اور نام نہاد مشروط طلب افرو نے ملک و ملت کو اپنی ذاتی ہوس اور سامراجی طاقتوں کی مفاد پرست خواہشات کا شکار بنانا شروع کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ ستار خان جیسے حقیقی مشروط خواہ شخص کے وجود کو بھی تحمل نہ کر سکے اور قتل ستار خان ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھیوں کے خلاف شرمناک پروپیگنڈوں کا بازار گرم کر دیا تاکہ عوام کے درمیان ان کا کوئی اثر و رسوخ باقی نہ رہ جائے۔ سماج میں اچھی طرح بدنام کرنے کے بعد ان لوگوں نے ستار خان پر بھی قاتلانہ حملہ کر دیا اور اس

تسلے کی وجہ سے وہ ایک مدت تک ہسٹریا پر پڑے رہے اور بعد میں انتہائی غم انگیز حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس طرح ایرانی عوام کی عدالت پسندانہ تحریک میں بنیادی کردار ادا کرنے والی مذہبی اور قومی شخصیتیں دھیرے دھیرے اس تحریک سے کنارہ کش ہو گئیں جس کے نتیجے میں انقلاب دشمن افرو و عناصر نے اس انقلاب پر غلبہ حاصل کر لیا۔ پس یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی سے قبل مظفر الدین شاہ کا صدر اعظم عین الدولہ جو مشروط طلب لوگوں کا جانی دشمن تھا اور جس نے محاصرہ تبریز کے دوران بیرونی فوجوں کا اعلائیہ ساتھ دیا تھا دس سال کا وقت گزرنے کے بعد مجلس شوریٰ ملی یعنی پارلیمنٹ کے ذریعہ دوبارہ صدر مملکت کا عہدہ حاصل کر لیتا ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ انقلابی جوش و خروش میں کمی آتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے ملک



سید محمد طباطبائی



شہید شیخ فضل اللہ نوری۔ سید عبد اللہ بیہانی

بظاہر خاتمہ ہو چکا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے آخری زمانہ میں روس میں انقلاب رونما ہوا اور متعدد اعلیٰ و خرابی مسائل و مشکلات نیز ملک میں رونما ہونے والی جدید صورتحال کی وجہ سے روس میں اب اتحاد نہ رہ گیا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ایران کے معاملات میں مداخلت کرے لیکن یہ تاریخی اور سنہری موقع بھی ایرانی حکومت اور عوام کے حق میں مفید و کارآمد ثابت نہ ہوا کیونکہ برطانوی فوجوں نے فوری طور پر پورے ملک پر اپنا فوجی اور سیاسی تسلط قائم کر لیا۔ ان لوگوں نے روس کی نئی حکومت کی نابودی و سرنگونی کے لئے دو ہتکنڈے ایک ساتھ استعمال کئے۔ پہلے ایران میں تعینات روسی فوج کو 'جو بالعموم سابقہ حکومت کی طرفدار تھی' اپنے ہاتھوں میں لیکر اسے روس کی موجودہ عوامی اور انقلابی فوج کے مقابلے کے لئے بھیج دیا اور دوسرے مرحلے میں ایران کی نام نہاد کمیونسٹ تنظیموں کی تشکیل کر کے انہیں روس کی سیاسی اور فوجی تنظیموں کے اندر رخنہ اندازی کے لئے متحرک کر دیا۔

ایسی صورتحال میں برطانیہ نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ ایران میں اپنی پسندیدہ حکومت قائم کر کے ایران میں اپنی فوجی اور سیاسی موجودگی کو قانونی حیثیت عطا کر دے۔ لہذا ۱۹۱۷ء میں ایران میں وفاق الدولہ کی کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ وہ مشروطیت طلب افراد کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ 'آزادی پسند اور صاحب مہارت سیاستداں سمجھا جاتا تھا۔ اس کابینہ کی تشکیل کے ایک سال بعد حکومت برطانیہ نے وفاق الدولہ کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کئے جس کو 'معاہدہ ۱۹۱۹ء' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے بموجب فوجی 'اور مالی کسٹم سے متعلق جملہ امور

حکومت نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن جنگ میں سرگرم روسی 'برطانوی اور عثمانی حکومتوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنی فوجیں ایران میں داخل کر دیں اور ایک دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی میں مشغول ہو گئے' ملک کے ماہرین سیاست اور قوم پرست افراد کے سامنے فقط یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ تہران سے ہجرت کر کے ملک کے مغربی حصہ میں چلے جائیں اور ایک عارضی حکومت کی تشکیل کر کے جرمنی اور ترکی کے ساتھ تعاون کا اعلان کر دیں۔ لیکن ان لوگوں کی اس سیاسی تحریک

میں سیاسی گڑبڑی 'سماجی اختلافات اور اقتصادی مفلوک الحالی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا۔ ملک کی اقتصادی حالت میں اصلاح و سدھار کے بجائے اور زیادہ خرابی پیدا ہو گئی۔ ملک کے اکثر صوبوں میں علاقائی بغاوت شروع ہو گئی اور صوبائی حکام نے مرکزی حکومت سے علیحدگی اختیار کرنا شروع کر دیا اور معاشرہ میں امن و سلامتی نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی۔ روس اور برطانیہ نے بھی پورے ایران میں پھیلی ہوئی گڑبڑی و مفلوک الحالی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک و ملت پر اپنے ناجائز اثر و رسوخ میں غیر



امام خمینی ۲۰ سال کی عمر میں
(بائیں طرف)
اپنے بڑے بھائی مرحوم
آیت اللہ پسندیدہ کے ہمراہ۔

سے بھی ایرانی عوام کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس عالمی جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہوا لیکن ایرانی عوام کو دیرانی و مفلوک الحالی کے علاوہ کچھ نہ ملا اور اس ملک میں ہر طرف قحط 'بھوک اور بیماری کا بول بالا ہو گیا۔ اس کے علاوہ مقامی گڑبڑی نیز ملک کے ہر گوشہ میں بیرونی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے استقلال و آزادی کا

معمولی اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اسی زمانہ میں پہلی جنگ چھڑ گئی۔ درحقیقت یہ جنگ ایرانی عوام کے سر پر پہلی کی طرح گریزی اور ان کی مصیبتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ حکومت ایران میں اتحاد نہ تھا کہ وہ ملک کے سیاسی استقلال کی حفاظت کر سکے۔ اگرچہ ایک مدت کے بعد اس

حل تلاش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی لہذا قبل اس کے کہ مشکلات اس پر غالب ہو جائیں اس نے خود ہی استعفیٰ دیدیا۔ واضح رہے کہ انقلاب مشروطیت کے بعد قومی رہنماؤں کی نظر بحرانی اور حساس سیاسی ماحول میں "استعفیٰ" ایک بہترین حل تھا کیونکہ ان لوگوں کو ملکی مفاد و مصالح کے مقابلے میں اپنی ذاتی حیثیت و شان و شوکت زیادہ عزیز تھی اسی وجہ سے جب کبھی انہیں اپنی حیثیت خطرہ میں نظر آتی وہ فوری طور پر استعفیٰ دیدیا کرتے تھے، مشیر الدولہ کے مستعفی ہونے کے بعد کمانڈر جنرل فتح اللہ خان تنکا بنی نے صدارت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی لیکن اس میں بھی اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ملک کے مسائل حل کر سکے۔

ادھر عراقی علماء ہزاروں مسلح و غیر مسلح افراد کے ہمراہ نجف سے کر بلا پہنچ چکے تھے جیسے ہی انہیں کر بلا میں فتح تہران کی اطلاع حاصل ہوئی انہوں نے سفر تہران کا ارادہ ترک کر دیا اور سب لوگ نجف واپس چلے گئے اور فاتحین نے اقتدار کو آپس میں اس طرح تقسیم کر لیا کہ روسی اور برطانوی ایجنٹوں کے درمیان توازن برقرار رہے۔

عالمی جنگ کے خاتمہ کے دو سال بعد نیز ملک سے روسی فوجوں کے نکل جانے کے بعد لوگوں نے امید لگا رکھی تھی کہ اب مظلوک الحالی و بے سرو سامانی فقر و گرسلی اور تباہی و بربادی کا دور ختم ہو جائے گا لیکن مسند اقتدار پر ایران والے حاکموں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ ایرانی عوام کی امیدوں کو پورا کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ فقط عوام ہی نہیں بلکہ ایران کے سیاسی ماہرین بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ ملک کی فلاح و بہبود ان حکمرانوں کی صلاحیت سے باہر ہے لہذا سبھی لوگ کسی ایسے حادثہ کا انتظار کر رہے تھے جو موجودہ صورت حال کو دگرگوں بنا دے، مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ ماہرین سیاست کو فوجی بغاوت اور عوام کو نجات و سلامتی کی فکر داسکیر تھی۔

امریکہ اور فرانس نے اس معاہدہ کی زور دار مخالفت کی اور نو تشکیل شدہ "اقوام متحدہ" نے بھی سرکاری طور پر اس معاہدہ کو تسلیم نہ کیا۔

وسیع اور شدید اختلافات اور مخالفتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے وفاق الدولہ نے معاہدہ کی عملی تعمیل کو روک دیا اور لازمی منظوری کے لئے اسے مجلس یعنی پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا۔ تیرہ سال بعد رونما ہونے والے اس واقعہ سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے بحرانی حالات میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے فاسد و خائن حکمرانوں نے تحریک مشروطیت کو کس حد تک منحرف کر دیا تھا۔

بہر حال وفاق الدولہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا کہ حکومت سے مستعفی ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مشیر الدولہ نامی شخص جو سماج میں نیک نام مگر نہایت مصلحت اندیش تھا اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن ملک کے مسائل کا

برطانوی مشیروں کے سپرد کردئے گئے تھے۔ دوسری جہات میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاہدہ نے ایران کو برطانوی نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنا دیا تھا۔

چنانچہ داخلی اور خارجی سطح پر اس معاہدہ کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ ملک کے اندر بعض اراکین پارلیمنٹ مثلاً سید حسن مدرس جیسے لوگوں نے کافی بڑے پیمانے پر ایرانی کابینہ کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا ملک کے غیر معمولی جاہل اور برطانیہ مخالف اخباروں اور رسالوں نے اس شرمناک معاہدہ کی وجہ سے وفاق الدولہ کا خوب مذاق اڑایا۔ آذر بائیجان میں شیخ محمد خیابانی اور گیان میں میرزا کوچک خان جنگلی نے اس معاہدہ کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔ حکومت نے مخالف افراد کی گرفتاری اور مخالف اخباروں و رسالوں پر سخت پابندی لگا دی پھر بھی معاہدہ کے خلاف عوامی احتجاج میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بیرونی سطح پر برطانیہ سے سامراجی رقابت رکھنے والے ممالک مثلاً روس

حوالے

۱۔ احمد کردی، تاریخ مشروطیت ص ۳۰۔

۲۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی ص ۱۵۱، ۱۵۲ "آخوند خراسانی"